خانقاہوں پر بریلویت کے اضافی اثرات

گزشتہ صدی کی اوّلین دہائیوں میں برصغیر میں تین مسلمان حضرات کی خاصی شہرت رہی اور تینوں نے اپنی اپنی انفرادی حیثیت قائم کی ہرچند کہ ان کے درمیان باہمی روابط بھی رہے، تاہم اُن میں مخاصمت کا عنصر مفاہمت سے کہیں زیادہ تھا۔ ان میں پہلے شخص ہیں غلام احمد قادیانی (پیدائش 1839، وفات 1908)، دوسری ہستی کا نام احمد رضا خان بریلوی (پیدائش 1856، وفات 1921) اور تیسری شخصیت تھی اشرف علی تھانوی (پیدائش 1863، وفات 1943) ان تینوں میں مشترکہ بات یہ ہے کہ یہ تینوں حضرات حنفی مسلک کے پیرو تھے اور انہوں نے مذہب اسلام میں تین مختلف تحریکوں کی نمائندگی کی جن میں پہلے دو اشخاص نے اپنے اپنے نئے مسلک بنائے اور تیسرے نے پہلے سے قائم شدہ ایک مسلک کو جلا بخشی۔ یہ تینوں مسالک بالترتیب قادیانیت، بریلویت اور دیوبندیت کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ غلام احمد قادیانی نے تو خود کو رسول اور مسیح موعود بتا کر ختم نبوت سے انکار کر دیا اور دعویٰ کر دیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اپنے اس انتہا پسند رویے سے وہ مذہب اسلام کے مرکزی افکار کے منکر ہو گئے۔ تاہم ان کے ساتھ بھی لوگ آ گئے اور ان کا بھی کارواں بن گیا۔

19 ویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں دو بڑے مدرسے قائم ہوئے، دار العلوم دیوبند (1866) اور دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنو (1894) دیوبند ایک طرح سے اسلامی نظام تعلیم میں انتہا پسند تحریک کا ضامن بنا اور ندوہ نے ایک معتدل راہ اختیار کی۔ احمد رضا خان صاحب کا رشتہ ان دونوں اداروں سے تھا، لیکن ذاتی اختلافات کی بنیاد پر انہوں نے ان دونوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور 1880 میں اہل سنت یا بریلوی تحریک کی ابتدا کی اور پھر 1904 میں خود اپنا مدرسہ، بریلی، پیلی بھیت اور لاہور میں قائم کیا۔

کئی محققین نے لکھا ہے کہ احمد رضا خان صاحب اور اشرف علی تھانوی صاحب دراصل دوست تھے اور دیوبند میں ساتھ پڑھتے تھے اور وہیں ان کے درمیان ناچاقی ہوگئی اور انہوں نے رابطہ ختم کر دیا۔ ہرچند کہ بریلوی حضرات اس بات سے انکار کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ دونوں کی عمر میں سات سال کا فرق ہے اس لئے ہم جماعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دار العلوم دیوبند ان دنوں خانقاہی نظام، درگاہ، مزار، اعراس، فاتحہ، میلاد وسلام وغیرہ کے خلاف ایک مرکزی حیثیت کا حامل تھا، آئے دن یہاں سے فتویٰ جاری کیا جاتا جن میں مشترکہ طور پر ان لوگوں کو جو خانقاہ یا درگاہوں سے منسلک تھے، بدعتی، مشرک، قبر پرست، ناچنے گانے والے، فاسق، گمراہ، کافر اور دوزخی قرار دیا جاتا تھا۔ دیوبندیوں کے علاوہ وہابی یا اہل حدیث یا سلفی یعنی غیر مقلد حضرات بھی پورے زور وشور سے فتوے جاری کر رہے تھے اور اہل سنت حضرات کو خارج از فہرست کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں احمد رضا خان صاحب کو ایک زبردست موقع مل گیا اور انہوں نے پوری قوت سے دیوبندیوں اور وہابیوں کے خلاف ایک نہایت جارحانہ مورچہ کھول دیا اور مزید شدّت کے ساتھ دیوبندیوں پر تکفیر کے فتوے دینا شروع کیا، یہاں تک کہ 1905 میں حرمین شریفین کے دو درجن علماء سے ندوۃ العلماء اور دار العلوم دیوبند کے خلاف کفر کا فتویٰ لیکر آ گئے۔ احمد رضا خان صاحب کی اس پہل سے ان لوگوں کو تقویت ملی جن کے خلاف دیوبند سے متواتر فتوے جاری ہو رہے تھے اور ان میں سے اکثر لوگوں اور اداروں نے خان صاحب کی درپردہ یا کھل کر پُرزور حمایت کی۔

خان صاحب تحریر وتقریر دونوں کے دھنی تھے اس لئے انکے مضامین خوب پڑھے جانے لگے اور تقاریر کی بھی مقبولیت بڑھتی گئی۔ فتاویٰ رضویہ کی ایک کے بعد ایک جلدیں شائع ہوتی رہیں یہاں تک کہ ان تعداد تیس جلدوں تک پہنچ گئی۔ سریع التحریر ایسے کہ دیکھتے ہی دیکھتے رسالوں

اور مضامین کا انبار لگا دیا۔ ان کی اپنی ذات بھی ایک معمہ تھی اور ان کی تحریریں بھی سوالات کے دائرے میں رہیں۔ مثلاً اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ چار سال کی عمر میں قرآن ختم کر دیا، چھ سال کی عمر میں تقریر شروع کی۔ غالباً خان صاحب نے کسی مدرسہ میں زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد نقی علی خان صاحب سے حاصل کی جنھوں نے ان کو اکیس علوم سکھائے اور مفتی کہ کر بلایا تو یہ مفتی ہو گئے اور تیرہ سال کی عمر میں پہلا فتویٰ دیا۔ لوگوں نے جب حافظ کہہ کر مخاطب کیا تو ایک مہینے میں پورا قرآن حفظ کر لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے بھائی مرزا قادر بیگ سے بھی پڑھا تھا۔ کئی ناموں سے جانے جاتے تھے مگر خود کو یہ عبدالمصطفیٰ کہتے تھے۔ شاعری خوب کرتے، انکی نعتیں کافی مشہور ہیں اور انکے پیرو انہیں تلمیذ رحمٰن مانتے ہیں، ہر چند کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے شاعروں کے تعلق سے فرمایا ہے کہ شاعر بیابانوں میں سر ٹکراتے پھرتے ہیں اور یہ کہ صرف بہ کے ہوئے لوگ شاعروں کی پیروی کرتے ہیں، تو ایسے میں اللہ تعالیٰ بھلا موصوف کی شاعری کے استاد کیسے ہو سکتے تھے۔

جناب احمد رضا خان صاحب کے فتوے اور ان کی دوسری تحریریں ہمیشہ موضوع بحث رہے۔ جیسے پیشاب پینے کو جائز قرار دینا، انگریزوں کی حمایت میں ہندوستان کو دارالسلام قرار دینا، تحریک خلافت کی مخالفت کرنا، شیطان کا نماز پڑھنا، یہ کہنا کہ قیامت کے دن حضرت علی دوزخ تقسیم کریں گے، خواب میں دیکھنا کہ رسول اللہ صلعم ان کے پیچھے جنازے کی نماز پڑھ رہے ہیں اور اس میں رسالت مآب کی خواہش شامل کا شامل ہونا۔ ان کے بارے میں ان کے معتقدین کہتے کہ اعلیٰ حضرت کی زیارت نے صحابہ کرام کی زیارت کا شوق کم کر دیا، یا ان کی مدح میں کسی نے لکھ دیا کہ

عرب میں جا کے آنا آنکھوں نے دیکھا جس کی صورت کو
عجم کے واسطے لاریب وہ قبلہ نما تم ہو

غرض جناب احمد رضا خان صاحب شہرت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے، جب جب اہل دیوبند قابلِ اعتراض فتوے صادر کرتے، جیسے کہ رسول اللہ صلعم بس ایک عام سے شخص تھے، یا یہ کہ اب وہ صرف قبر میں آرام کر رہے ہیں، یا حضور صلعم کو غیب کا علم قطعی طور پر نہیں تھا، شیطان کا علم رسول اکرم صلعم سے زیادہ تھا، تب تب جناب خان صاحب کے تیور تیکھے ہوتے جاتے تھے۔ اور پھر اذان میں انگوٹھا چومنے سے لیکر حضور صلعم کو نور مجسّم اور حاضر و ناظر ماننے تک نہ جانے کتنے فتوے اور دلائل سامنے آنے لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ موصوف کے یہ اقدام حب علی سے زیادہ بغض معاویہ کی وجہ سے تھے۔ عاشقِ رسول ہونے کا دعویٰ، نعرۂ رسالت کا لگانا، نماز میں قیام و قیود کے طریقے، بعد نماز سلام کا پڑھنا، سبز پگڑی کا باندھنا یہ سب اکثر مبالغہ آرائی یا غلو کی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔ دراں حالیکہ اللہ اور اس کے رسول صلعم نے شریعت میں غلو اور تقصیر دونوں کو غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ مسند احمد کی حدیث ہے کہ قرآن پڑھا کرو اور اس میں غلو نہ کرو۔ نیز یہ کہ اسلام میں اوسطیت یعنی معتدل راستے کو بہتر مانا گیا ہے۔ اس طرح آنحضرت کی ذات بابرکات کے تعلق سے دیوبندیوں کی تقصیر اور بریلویوں کا غلو دونوں ایک دوسرے کے متناسب ہیں۔

زمانۂ شباب میں ہی انہیں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ مستقبل ان کا منتظر ہے، اور ان میں عوام کو اپنے جانب متوجہ کرنے کی مقناطیسی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ دیوبندیت کے متوازی مگر مخالف شناخت کے لئے کسی مرشد کے دامن کا سہارا بہت ضروری بھی تھا اور عوام میں مقبولیت کا ضامن بھی۔ ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے احمد رضا خان صاحب نے اپنی بیعت کے لئے مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ، اتر پردیش کی خانقاہ برکاتیہ کی طرف رجوع کیا اور اس وقت کے صاحب سجّادہ حضرت شاہ آل رسول رحمۃ اللہ علیہ سے سلسلۂ قادریہ میں مرید ہوئے۔

لیکن یہ انکی منزل کا پہلا زینہ تھا۔ خان صاحب کا ارادہ اپنی پیری مریدی شروع کرنے کا تھا، اور اسکے لئے مرشد کی اجازت وخلافت ضروری تھی۔ اس لئے انہوں نے مرشد سے درخواست کی۔ چونکہ اس وقت تک ان کی شہرت عروج پر پہنچ چکی تھی، اس لئے پیر نے اپنے قریب ترین مرید کو مایوس نہیں کیا اور سلسلۂ قادریہ کی خلافت عطا کی۔ ہر چند کہ خانقاہوں میں غیر سید کو خلافت مل بھی جائے تو مرید کرنے کی اجازت شاید ہی ملتی ہے، تاہم انہیں خلافت بھی ملی اور اجازت بھی۔ شاید کہ یہ انکے محبوب ترین مریدوں میں تھے کیونکہ اہل بریلوی حضرت شاہ آل رسول رحمہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ قیامت میں اللہ پوچھے گا کہ کیا لائے ہو تو میں کہوں گا کہ، احمد رضا لایا ہوں۔ ان کا یہ قول پڑھ کر حضرت محبوب الٰہی کے بارے میں امیر خسرو کا قول یاد آ گیا۔ بلکہ یہ تو اس سے بھی بڑا قول ہے کہ مرشد اپنے مرید کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ خانقاہ مارہرہ شریف کی عنایات کی بدولت مولانا موصوف نے پیری مریدی بھی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے انکے مریدوں کی تعداد انکے مرشد کے مریدوں سے بھی زیادہ ہوگئی۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا انتقال 28 اکتوبر 1921 کو 65 سال کی عمر میں ہوا اور اُن کا مزار انکے آبائی وطن بریلی میں ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی میں اپنے بریلوی مسلک کی جڑیں اتنی مضبوط کردیں تھیں کہ ان کے انتقال کے بعد بھی اُن کے وارثین کی موافق آبیاری سے آج بھی قائم ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کے پیروکار چہار عالم میں اپنے مسلک کی تبلیغ واشاعت میں شدت سے مشغول ہیں اور انہوں نے اپنی ایک دلکش برانڈ بنائی ہے جس میں ان کی رنگین ٹوپیاں دور سے پہچانی جاسکتی ہیں، متعدد مدرسے قائم کئے، جہاں سے فارغین نکل کر ملک وبیرون ملک اپنے عقیدے کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک تربیت یافتہ نعت خواں اور مقرر ہیں، اپنی شعلہ بیانی کا لوہا منوا رہے ہیں۔ ان کی اپنی منتخب مساجد ہیں جہاں ان کی نشست، برخاست، حرکات، سکنات وادائیگی نماز کے اپنے طریقے ہیں۔ سنا ہے کہ ان مساجد میں غیر بریلویوں کا داخلہ ممنوع ہے، واللہ عالم بالصواب۔

گزشتہ بیس پچیس سالوں سے بریلوی حضرات کی نظر عنایت ملک کی درگاہوں اور خانقاہوں پر رہی ہے اور اپنے مسلک کے دائرے کو خانقاہوں کی سرحد تک پہنچا چکے ہیں۔ یوں تو مارہرہ اور کچھوچھہ میں ان کے قدم مولانا احمد رضا خان صاحب کی زندگی میں ہی جم چکے تھے، ان کے وارثین نے مزید خانقاہوں کو اپنے بازو میں سمیٹنے کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ درگاہوں پر حاضری دینے لگے، صاحبانِ خانقاہ سے ربط ورسم بڑھائی، تحائف ونذر پیش کرنا شروع کی، بڑی بڑی دعوتیں سجائیں، جلسوں کی صدارت سجادگان سے کروانے لگے، مجالس سماع میں شرکت کرنے لگے (حالانکہ خود مولانا بریلوی نے سماع کو صحیح نہیں ٹھہرایا ہے، کیوں کہ قادریہ سلسلہ میں سماع کی ممانعت ہے)۔ رفتہ رفتہ بڑھ کر خانقاہوں میں عرس میں تقریر بھی کرنے لگے۔ اس طرح صاحبان خانقاہ کا ان حضرات پر انحصار بڑھتا گیا۔ یوں بھی بریلوی حضرات اپنے ساتھ اپنے اپنے ہم نواوں کا مجمع بھی ساتھ لاتے جس سے بھیڑ بھی بڑھنے لگی اور اس طرح ان بریلوی حضرات کو اپنا مسلک پھیلانے کا ایک بڑا پلیٹ فارم مل گیا۔ انکی تقاریر میں صاحب سلسلہ کا ذکر دس منٹ اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ذکر آدھے گھنٹے کا ہونے لگا، دوران تقاریر نعرے بازی ہونے لگی۔ اب معاملہ یہ ہے کہ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، بلکہ حالات اتنے بے قابو ہو رہے ہیں کہ خانقاہی امور میں بریلوی حضرات کی دخل اندازی بہت بڑھ گئی ہے اور اکثر بریلوی مولانا کھلے عام خانقاہی نظام اور سجادگان کی ذاتی زندگی پر تبصرے کر رہے ہیں۔ اپنی الگ چادریں چڑھا رہے ہیں، بزرگان کی کتابیں چھپوا رہے ہیں، اعراس میں پریس کانفرنس کر رہے ہیں۔

اہل خانقاہ یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ ان بریلوی حضرات کو نہ ان سے دلچسپی ہے اور نہ ان کے پیران سے، ان کا صرف اور صرف مقصد بریلویت کا فروغ ہے اور تمام زیب سجادگان اور خانقاہوں کا استعمال اسی مقصد کے تحت کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آنے والے وقت میں خانقاہوں کی حالت مغلیہ سلطنت کے آخری دور جیسی ہوگی، جہاں تخت پر تو بادشاہ سلامت جلوہ افروز رہتے تھے لیکن عنان حکومت فرنگیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یا حالات کندھا کسی اور کا اور بندوق کسی اور کی کے مصداق ہو جائیں گے۔ آنے والے دور میں عین ممکن ہے کہ یہ اثرات اتنے بڑھ جائیں کہ مشائخین کے جانشینوں کے انتخاب میں بھی صاحبان بریلی کی مرضی مقدّم سمجی جانے لگے۔ میری نظر میں ملک کی بس کچھ خانقاہیں ایسی ہیں جہاں ان کے امور خانقاہی بریلویت کے اثرات سے ہنوز محفوظ ہیں۔

دراصل میں نہ بریلویت کا دشمن ہوں نہ مولانا احمد رضا خان کا مخالف ہوں، بلکہ مولانا کا معترف ہوں کہ انہوں نے چالیس، پینتالیس سال کے عرصے میں اپنے زور قلم اور فن خطابت سے ایک مضبوط تحریک کی بنیاد ڈالی اور ایک مستحکم فرقہ بندی کے ذریعے اپنے مخالفین، خصوصاً دیوبندیوں اور وہابیوں کو ناقابل شکست چیلنج دیتے رہے اور ان کے وارثین انکے مشن کو تندہی سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہمارا اصل مقصد اہل خانقاہ حضرات کا اپنے روایتی اقدار سے انحراف اور بریلویوں کی تقلید سے ہے۔ مثال کے طور پر خانقاہوں میں انکی روایتی ٹوپیاں غائب ہو رہی ہیں اور رنگین، گول اور اونچی ٹوپی دور سے نظر آجاتی ہے۔ یقین مانیے یہ ایک مضبوط علامت ہے انکی تعداد کی اور انکے اپنے عقیدے سے یگانگت کی۔ دوسرے لفظوں میں ہر چند کے وہ آپ کے ساتھ ہیں مگر، نہیں ہیں۔ اعراس کے موقع پر بریلوی مولویوں کی تقریر کا موضوع و مواد، بیچ بیچ میں نعرے بازیاں۔ خانقاہوں میں نعرے فقراء لگاتے تھے مقرر اور سامعین نہیں۔ سلام جان رحمت والا کے آخر میں سیّدی اعلیٰ حضرت پہ لاکھوں سلام کہنا۔ اسی طرح نمازوں میں اپنے آبا و اجداد کی روایات میں اختراع، دوسرے مسالک کے ماننے والوں پر تنقید کرنا، یہ اعمال وہ ہیں جس کی مثال دو تین دہائی پہلے، خانقاہوں میں نہیں ملتی۔ ان باتوں پر مشائخین اور سجادگان کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اور بریلویت کے بڑھتے سائے میں اپنی شبیہ کو مدغم ہونے سے بچانا چاہئے۔ انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے اسلاف کی میراث، انکے تبرکات، انکی روایات اور ان کے اوصاف شریعت و طریقت، انکے اشغال و عبادات کے صرف محافظ ہیں مالک نہیں اس لئے انہیں اپنے اجداد کی طرف مراجعت کرنی چاہئے اور پشت در پشت چلے آرہے خانقاہی طریقۂ کار میں بیجا تحریف سے احتراز کرنا چاہیے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

پروفیسر سید علی احمد فردوسی

خانقاہ منیر شریف

aafirdausi30@gmail.com